Vol.5 No.2 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

اردو افسانے پر صارفیت کے اثرات

IMPACTS OF CONSUMERISM ON URDU FICTION

طاہرہ فاطمہ

پی ایچ۔ڈی اردو(اسکالر)اورینٹل کالج،پنجاب یونی ورسٹی،لاہور

ABSTRACT

Consumerism is a pivotal tendency of today. Scientific development, modern technology, inventions, facilities, improvement of living standards, free media and advertising have further strengthened this inclination. Today's world is ruled by corporate companies. One of the downsides of consumerism is that it has made everything in a commodity. Themes such as collapse of common values, materialistic thought, oppression, exploitation, mental stress, social alienation and loss of self-identity are some common features expressed in Urdu fiction. Consumerism is also benefited by electronic and print media, social media and modern technology. Urdu fiction is highly influenced by these facts. The article sheds light on the vast impact of consumerism on Urdu fiction.

Keywords: *Consumerism, Urdu fiction, modern Inventions, free media, advertising, alienation, commodity.*

صارفیت دورِ حاضر کا اہم رجحان ہے۔ جدید سائنسی ترقی، ایجادات، تعیشات، معیارِ زندگی کی بہتری، آزاد ذرائع اِبلاغ اور اشتہار سازی نے اس رجحان کو مزید تقویت دی ہے۔ آج کی دنیا پر کارپوریٹ کمپنیوں کی حکمرانی ہے۔ صارفیت کے منفی رجحانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے ہر شے کو پیداوار کا درجہ دے دیا ہے۔ صارفیت کے زیرِ اثر اقدار کی شکستگی، مادیت پسندانہ سوچ، جبر و استحصال، ذہنی تناؤ، سماجی بے گانگی اور ذاتی شناخت کی گم شدگی جیسے موضوعات بھی اردو افسانے میں بیان ہوئے ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی سے بھی صارفیت کے رجحان نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ اردو افسانہ نویس نے ان تمام حقائق سے گہرا اثر لیا ہے۔ مقالے میں صارفیت کے اردو افسانے پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: صارفیت، اردو افسانہ، جدید ایجادات، آزاد ذرائع ابلاغ، اشتہار سازی، بے گانگی، اشیائے صرف۔

صارفیت دورِ حاضر کا اہم رجحان ہے۔ جدید سائنسی ترقی، ایجادات، آزاد ذرائع ابلاغ، اشتہار سازی، تعیشات اور معیارِ زندگی نے اس رجحان کو پروان چڑھایا ہے۔ صارفیت نے ہر شے کو دولت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا نے صارفیت کے بیشتر مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ آج کی دنیا پر کارپوریٹ کمپنیوں کی حکمرانی ہے۔ یہ کمپنیاں اپنے مفاد کے لیے پورے نظام کو یرغمال بنالینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور دنیا بھر کے اثاثے ان کے پاس گروی ہیں۔ اردو افسانے میں صارفیت اور کارپوریٹ کلچر کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

آج کے دور میں کارپوریٹ کمپنیاں، نو آبادیاتی اور استعماری نظام کا نیا حربہ بن چکی ہیں۔ غیر منصفانہ معاشی نظام اور طبقاتی کشمکش نے ہر شے کو منڈی میں فروخت ہونے والی جنس کا درجہ دے دیا ہے۔ بیدی کا افسانہ ''ایک باپ بکاؤ ہے'' صارفیت اور مادیت کے پس منظر میں خاندانی نظام کی تباہی اور رشتوں کی پامالی کا المیہ پیش کرتا ہے۔

جدید صنعتی نظام میں کام کا حد سے زیادہ دباؤ، بیزاری، تھکاوٹ اور صوتی آلودگی نے انسان کو ذہنی تناؤ کا شکار کر کے اسے سکون سے محروم کر دیا ہے۔ صارفیت اور کارپوریٹ کلچر کی عکاسی منٹو کے بعض افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ''بُو'' ''سوکینڈل پاور کا بلب'' اور ''چچا سام کے نام خطوط''، کارپوریٹ کلچر کی چیرہ دستیوں کی داستان سناتے ہیں۔ ''بُو'' اور ''سوکینڈل پاور کا بلب'' منظر نامہ ممبئی شہر کا ہے جو بہت بڑا کارپوریٹ شہر ہے۔ یہاں بڑی بڑی کمپنیوں اور سرمائے کی افراط نے اسے بڑے کاروباری مرکز کی حیثیت دی ہے۔

منٹو کے افسانے ''سوکینڈل پاور کا بلب'' میں ممبئی شہر میں منڈی اور بازار کا اتار چڑھاؤ اور حرکیات پوری طرح کارپوریٹ کلچر کے تابع ہے۔ اس افسانے میں طوائف زوال آمادہ کلچر کی اہم علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ طوائف جس شکستہ کوٹھڑی میں مقیم ہے اس پر بھی ویرانی اور افلاس کے ڈیرے ہیں۔ طوائف پر نیند کا سخت غلبہ ہے مگر دلال اسے اس کی مرضی کے برخلاف گاہک کے ساتھ چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے کے انجام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قاضی عابد اپنے مقالے ''موجودہ کارپوریٹ کلچر اور منٹو کی تخلیقی دنیا'' میں لکھتے ہیں:

> ''گاہک کے لیے انتظار اور گاہک کا نہ آنا اور کئی دنوں تک اس کا جاگتے رہنا یہ سب بہ ظاہر تو کارپوریٹ کلچر سے تعلق نہیں رکھتے لیکن یہ اس نحوست بھری ثقافت کا ان دیکھا جبر ہے جو ان لوگوں کے لیے ایسا مہیب بیانیہ ہے جو اس ثقافت کے اندر تحریر کیا گیا ہے۔ بالآخر تنگ آکر وہ خاتون اپنے دلال کو جو کارپوریٹ کلچر کی کٹھ پتلی ہے مار ڈالتی ہے۔۔۔۔ منڈی، بازار اور اس کی حرکیات جب کارپوریٹ کلچر کے تابع ہوتی ہے تو انسان لاشے میں ڈھل جاتا ہے۔ ظالم، ظلم اور مظلوم کی حد بعض اوقات اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ حقیقت اور وضع کردہ حقیقت میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔[1]

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کارپوریٹ کلچر کا ایک اور اہم حربہ جنگ ہے۔ جنگ کے ذریعے کارپوریٹ کلچر دنیا پر اپنی مرضی کا ایجنڈا نافذ کرتا ہے۔ عالمی طاقتیں اور ایجنسیاں اپنے مقاصد کے لیے تیسری دنیا کے ممالک کو آلۂ کار بنا کر اپنا اسلحہ بیچتی ہیں۔ اسی طرح عالمی طاقتوں کی باہمی چپقلش کا نشانہ بھی غریب اقوام بنتی ہیں۔ منٹو نے ''چچا سام کے نام خط'' کے عنوان سے نو خطوط لکھے جو ان کے مجموعے ''اوپر، نیچے اور درمیان'' میں شامل ہیں۔ ان خطوط میں منٹو نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں عالمی سیاست اور کارپوریٹ کلچر کی چیرہ دستیاں بے نقاب کی ہیں۔ ''چچا سام کے نام ساتواں خط'' کے تحت منٹو لکھتے ہیں۔

> ''چچا جان میں نے ایک بڑی تشویش ناک خبر سنی ہے کہ آپ کے یہاں تجارت اور صنعت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ آپ توماشاء اللہ عقل مند ہیں لیکن ایک بے وقوف کی بات بھی سن لیجیے۔ یہ تجارتی اور صنعتی بحران اس لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ نے کوریا کی جنگ بندی کر دی ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی اب آپ ہی سوچیے کہ آپ کے ٹینکوں، بم بار ہوائی جہازوں اور بندوقوں کی کھپت کہاں ہو گی۔۔۔۔ کوریا کی جنگ آپ نے بند کرا دی ہے یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ خیر اس کو چھوڑیے۔ آپ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع کرا دیجیے۔۔۔۔ قبلہ ذرا سوچیے یہ جنگ کتنی منفعت بخش ہو گی۔ آپ کے تمام اسلحہ ساز کارخانے ڈبل شفٹ پر کام کرنے لگیں گے۔ آپ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی اور سر کڑاہے میں''۔۲؎

''چچا سام کے نام پانچواں خط'' میں منٹو چھیڑ چھاڑ کے انداز میں چچا سام سے ایک ایٹم بم بھجوانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں:

> ''میں ناراض ہوں۔ ناراضی کا باعث یہ ہے کہ آپ نے مجھے میرا تحفہ (ایٹم بم) ابھی تک نہیں بھیجا''۔۳؎

> ''کتنی معمولی بات تھی۔ میں نے صرف ایک چھوٹا، بہت ہی چھوٹا ایٹم بم مانگا تھا۔۔۔۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میری خواہش کو شدت سے محسوس نہیں کیا یا شاید آپ ہائیڈروجن بموں کے تجربات میں مشغول تھے''۔۴؎

دورِ حاضر کے تجارتی مقاصد نے انسان سے اس کی فطری معصومیت اور تحیّر چھین لیا ہے۔ وہ زندگی کے حسن اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہو چکا ہے۔ مادیت پرستی کے غلبے نے ہر شے کو اس کے حقیقی جوہر سے محروم کر دیا ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ ''جو کچھ جیسا ہے، جہاں ہے'' میں صارفی معاشرے میں انسان کے اپنی بنیادوں اور زمین سے کٹ جانے کا المیہ بیان ہوا ہے۔ کہانی میں ایک خاتون کو آم کی گٹھلی زمین میں بوتے ہوئے بچپن میں سُنی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ کہانی میں ایک بچے نے بوڑھے کسان سے استفسار کیا کہ بابا! تم درخت لگا رہے ہو، کیا اس کے اُگنے اور پھل دینے تک زندہ رہو گے۔ خاتون سوچتی ہے کہ ایسے اندیشے آج کی نسل کے ذہن میں کیوں جنم نہیں لیتے:

> '' بچے اس قدر مہذّب اور دنیادار ہیں کہ انھوں نے آج تک یہ سوال مجھ سے نہیں کیا۔ خود میرے دل میں بھی یہ سوال کبھی نہیں ابھرا۔ شاید اس لیے کہ اب زندگی اور موت کی حدیں آپس میں گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ اب موت کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں رہی۔ شاید زندگی اور موت اور موسموں اور دنوں کا پہیہ اتنی تیزی سے گھومنے لگا ہے کہ کچھ سوچنے، محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ایک تاثر دوسرے میں گھل مل جاتا ہے۔ لوگ دیر تک ایک کیفیت کو سہارنے کے قابل نہیں رہے۔ وی سی آر کی طرح زندگی کو بھی فارورڈ کر دیتے ہیں''۔۵؎

خالدہ حسین کے افسانے "جو کچھ جیسا ہے جہاں ہے" میں دکھایا گیا ہے کہ ابھی نئے تعمیر شدہ مکان سے مکین کا رشتہ قائم نہیں ہونے پاتا کہ جدید تجارتی معاشرے کا طوفان اسے اپنے نرغے میں لے لیتا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر اور مکانوں کے بیوپاری کچے ذہنوں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتے ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانے میں پراپرٹی ڈیلر ''خانم'' جو ''سنگم میرج بیورو'' بھی چلاتی ہے اپنے علاقے میں نووارد ایک خاندان کے چشم و چراغ کو راتوں رات امیر ہونے کا نسخہ بتاتی ہے۔ وہ لڑکا اپنی ماں کو خانم کی کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

> ''۔۔۔ آپ تو سنجیدہ ہو گئیں۔ بھئی وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ آج کی دنیا میں ہر شے کی قیمت ہے اور یہ فن تو کوئی کوئی جانتا ہے کہ اپنی قیمت کس طرح آنکی جاتی ہے، بڑھائی جاتی ہے، ورنہ معلوم ہے وہ عقل مند جہاں دیدہ خاتون کیا کہہ رہی تھی؟ پہلے اس نے مجھے کولڈ کافی پیش کی پھر کہا۔ جب کوئی خود اپنی قیمت نہیں لگاتا تو اس کو نیلام کر دیا جاتا ہے''۔۶؎

بہتر معیارِ زندگی کی دوڑ نے سادگی، ہمدردی، محنت اور دیانت جیسے اوصاف کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج کا انسان ہر قیمت پر معیار زندگی بلند کرنا چاہتا ہے۔ صدیوں پرانی اقدار زوال کا شکار ہیں اور فرد روحانی اور اخلاقی لحاظ سے تہی دست ہوتا چلا جا رہا ہے۔

صارفیت کے زیر اثر سماجی بے گانگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکی ماہر سماجیات رائٹ ملز جدید سماج میں بے گانگی کے اثرات کے بارے میں کہتا ہے کہ جدید صارفی سرمایہ دار معاشرے نے سماج کی ایسی صورت گری کر دی ہے جس میں ایک فرد کو کام کے بدلے اپنی شخصیت اور جسم و جاں کا سودا کرنا پڑتا ہے:

> ''صارفیت اصل میں اقتصادیات سے متعلق اصطلاح ہے۔ صارفیت کے نظریے کے حامل افراد اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی فلاح و بہبود اور اس کی خوشی اور تسکین کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ کس حد تک اشیاء کو بڑے پیمانے پر صرف کر سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ مادی اشیاء کو کس مقدار میں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ فلاح و بہبود کا تصور صرف اور صرف افراد کے معیار زندگی پر ہی منحصر نہیں ہے بل کہ فرد کی تسکین کا مرکز یہ ہے کہ وہ کتنی مقدار میں اشیائے خورونوش کو استعمال کر سکتا ہے۔ خرید سکتا ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے''۔۷؎

کرشن چندر کا افسانہ ''عورتوں کا عطر'' صارفی معاشرے کی غیر انسانی سوچ پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ جوگندر پال کے افسانے "مارکیٹ اکانومی" میں اشیا کی صرفی اہمیت کے اسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے:

Vol.5 No.2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

”مس لالہ آدمی تو قدرت کا سُپر کمپیوٹر ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان نے اسے ٹریڈ وردی بنانے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مال ساتھ ساتھ بکتا نہ رہے تو افراط قلت سے بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے“۔

”سٹف! کیا آدمی بھی کوئی بکنے کی شے ہے؟“۔

”وائی ناٹ! نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہ ہو“۔

”ہم جہاں جو بھی بیچتے ہیں مس لالہ، وہاں دراصل اپنا ہی بھاؤ تاؤ کرتے ہیں“۔8

صارفیت کے ذریعے آج انسان کو نام نہاد نظریات اور گھڑی ہوئی دانش کا قائل کیا جا رہا ہے۔ لفظ، معنی سے تہی اور کلیشے بنتے جا رہے ہیں۔ حقیقی سچائیاں معدوم ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ تشکیلی حقیقتیں (Hyper- realities) لے رہی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اپنی تصنیف مابعد جدیدیت میں غائب حقیقت یا تشکیلی حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”یوں سمجھیں کہ Hyperreal دنیا میں محاکات اور حقیقتیں ایک دھاکے کی صورت میں باہم مدغم ہو چکی ہیں۔۔۔۔۔ مارکسیت ہر معاملے کے عقب میں مارکیٹ کے اصولوں کو کارفرما دیکھتی ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ مارکیٹ اب عقب میں نہیں رہی بل کہ ہر چیز کے اندر موجود ہے“۔9

صارفیت نے انسان کو بھی ایک کل پرزے میں ڈھال دیا ہے۔ نجم الحسن رضوی کے افسانہ ”شہر آشوب“ کے مرکزی کردار کو ڈاکٹر نے کار سواری ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ مشینوں کے مکمل بائیکاٹ سے اپنے دن کا آغاز کرتا ہے لیکن سارا دن اس کا واسطہ قسم قسم کی مشینوں اور بے ہنگم شور سے پڑتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شور میں با معنی آوازیں کھو گئی ہیں اور لوگوں کے پاس ایک دوسرے کی خبر گیری کے لیے بھی وقت نہیں بچا:

”شاید ڈاکٹر کا کہنا سچ ہے کہ لوگ بیمار ہو گئے ہیں۔ ان کے ہونٹوں نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اب انھیں استعمال نہیں کیا جاتا۔ ان کے کانوں میں شور کے آویزے ہیں۔ پاؤں میں سرعت رفتار کی کھڑاؤں اور آنکھوں میں طمع کے بلیک ہول۔۔۔۔“۔10

صارفیت کے تاجرانہ حربوں سے انسان کی فطری صلاحیتوں کو ضعف پہنچا ہے۔ مشینوں کی بہتات سے صنعتوں کے لیے مزدوروں کی کھپت کم ہو گئی ہے۔ مشینوں پر بڑھتا ہوا انحصار بیشتر انسانی حسیات کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ منشایاد اپنے افسانے ”کوک بھرے کھلونے“ میں اس المیے کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

”یاد آیا کیلکولیٹر ایجاد ہونے سے پہلے میں ایسی بہت سی لمبی لمبی ضربیں زبانی دے لیتا تھا اور مجھے سارے پہاڑے بھی یاد تھے مگر اس کیلکولیٹنگ مشین نے ذہن کو کند کر کے رکھ دیا ہے۔ اب بچے پوچھتے ہیں پہاڑے کیا ہوتے ہیں دادا جی۔ سبزی والا بھی اب پانچ کو نو سے ضرب دینے اور اڑتیس میں پچیس جمع کرنے کے لیے کیلکولیٹر استعمال کرتا ہے مگر اب مشین کے ساتھ رہنا ہوگا چاہے اس سے چلنے والے اعضاء کی اپنی کارکردگی آہستہ آہستہ زیرو ہو جائے“۔11

صنعت کا پہیہ جس قدر تیزی سے گھوم رہا ہے، جسمانی محنت پر مدار اسی لحاظ سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جوگندر پال کے افسانہ ”گرین ہاؤس“ کا کردار آج کے انسان کے ذہنی اضطراب سے پردہ اٹھاتا ہے:

”ڈیوک آف ایڈنبرا سے میری اپوائنٹ منٹ کا وقت گزرا جا رہا تھا اور مجھے گاڑی کا پہیہ تبدیل کرنے کے خیال سے الجھن ہو رہی تھی۔ پانچ سات منٹ گومگو میں ہی گزر گئے اور پھر مجھے ایک دم جیسے اپنی مشکل کا حل سوجھا۔۔۔ ارے۔۔۔۔! دو سو گز کا فاصلہ ہی تو ہے۔ پیدل ہی کیوں نہ چلا جائے۔۔۔ ارے ہاں۔۔۔ اس انکشاف پر خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میرے ٹانگیں بھی ہیں۔۔۔“۔ (گرین ہاؤس)12

صارفیت کے حربوں سے استحصال پر مبنی معیشت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ قوتوں کا گٹھ جوڑ اور زمیندار طبقے کے سامنے عوام کی بے بسی کا اظہار انتظار حسین کے ”بیریم کاربونیٹ“ میں بہت مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ چوہوں سے بچنے کے لیے ایک آبادی کے باشندے عرصہ دراز تک ”بیریم کاربونیٹ“ کا انتظار کرتے ہیں۔ ”بیریم کاربونیٹ“ طلب زیادہ ہونے کی وجہ سے بلیک میں فروخت ہوتی ہے لیکن جونہی بلٹی آتی ہے تو اہل علاقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی بار سوخ زمیندار اس کا سودا کر لیتے ہیں۔13

آج کے دور میں پروپیگنڈا مشینری، پوری طرح فعال ہے اور عالمگیریت کے نام پر دنیا بھر کا سرمایہ تیزی سے مٹھی بھر کمپنیوں کی جیب میں منتقل ہو رہا ہے۔ یہ کارپوریشنیں پروپیگنڈا کے ذریعے دنیا کو کنٹرول کرتی ہیں اور ذہنوں پر غلبہ حاصل کرتی ہیں اور سادہ لوح عوام کو یہ باور کراتی ہیں کہ دنیا میں مسرّت کے حصول کا واحد راستہ صارفیت سے ہو کر گزرتا ہے۔

صارفیت کے اس رجحان نے مقامی صنعتوں کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا "نیلا پتھر" اور سبین علی کا "کتن والی" میں مقامی صنعتوں اور روایتی پیشوں کے زوال کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ گھریلو خواتین کو دست کاری اور ہنر کی فروخت کے لیے کوئی منڈی میسر نہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار مائی جولاہی ہے۔ اس کردار پر فرخ ندیم اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مائی جولاہی ایک ثقافت کی علامت بھی ہے جو دن بدن اربنائی زیشن کا شکار ہو کر سکڑتی جا رہی ہے، لیکن مشینوں کی یلغار کے سامنے یہ ثقافت بے بس ہے اور ایک دن معدوم ہو جاتی ہے“۔14

صارفیت کے تحت مادیت پرست معاشرے میں ہر شے بازاری جنس اور پراڈکٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹی میں صارف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ہر شے کو صارف کی طلب اور ضرورت کے مطابق ڈھلنا پڑتا ہے۔

اردو افسانہ نویسوں نے عصر حاضر میں صارفیت سے پیدا شدہ صورت حال کا باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ صارفیت کے زیر اثر اردو افسانے میں فکری اور فنی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ صارفیت کے زیرِ اثر اقدار کی شکستگی، مادیت پرستی، مقامی صنعتوں کا زوال، ذخیرہ اندوزی، سماجی جبر و استحصال اور طبقاتی کشمکش جیسے موضوعات اردو افسانے کا حصہ بنے ہیں۔ اردو افسانہ نویسوں نے صارفیت کے زیر اثر فرد میں ہونے والی نفسیاتی تبدیلیوں اور محرکات کا سراغ بھی لگایا ہے نیز معاشرے میں منافقت، دھوکا دہی، حرص اور بددیانتی جیسے عناصر کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اردو افسانے میں صارفیت کے فروغ میں سائنسی رجحانات اور ٹیکنالوجی کا کردار بھی زیر بحث آیا ہے۔ مشینی اور میکانکی زندگی نے انسانی حسیات کو نقصان پہنچایا ہے۔ صارفیت کے تحت معاشرے میں ایک نئے نظریہ ضرورت نے جنم لیا ہے۔ اردو افسانہ نویسوں نے صارفیت کے فرد اور معاشرے پر اثرات کا ادراک کرتے ہوئے صارفیت کے تمام نمایاں پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

حوالہ جات:

1. قاضی عابد، ڈاکٹر، "موجودہ کارپوریٹ کلچر اور منٹو کی تخلیقی دنیا"، در دریافت، مدیران: ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر عابد سیال، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، جنوری 2013ء، شمارہ 12، ص 86

2. سعادت حسن منٹو، اوپر نیچے اور درمیان، لاہور: گوشہ ادب، 1954ء، ص 273

3. ----ایضاً----ص 241

4. ----ایضاً----ص 242-243

5. خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء، ص 458

6. خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء، ص 464

7. رائٹ ملز بہ حوالہ سنبل نسیم، "پاکستانی اردو افسانے میں نظریہ صارفیت"، در بازیافت، مدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران، لاہور: شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، جنوری تا جون 2017ء، شمارہ 30، ص 161۔

8. جوگندر پال، جوگندر پال کی کہانیاں، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 2005ء، ص 196

9. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع دوم، 2018ء، ص 68-69

10. نجم الحسن، رضوی، انٹرنیٹ کیفے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2002ء، ص 60-61

11. منشایاد، میں اپنے افسانوں میں تمھیں پھر ملوں گا (افسانوی کلیات)، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2011ء، ص 740

12. جوگندر پال، جوگندر پال کی کہانیاں، دہلی: تخلیق کار پبلشرز، 2005ء، ص 137-138

13. انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء، ص 992

14. فرخ ندیم بہ حوالہ نسترن احسن فتیحی (مرتب)، ایکو فیمینزم، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2019ء، ص 162